شاہد حسین رزاقی

تاثرات

ہماری زندگی کے مختلف شعبوں اور بالخصوص ہمارے دینی اور معاشرتی حالات میں جو خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں ان کو دور کرنے کے لیے موثر عملی تدبیریں اختیار کرنا انتہائی ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں علماء پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور عام مسلمانوں کی نظر میں ان کو جو اہمیت حاصل ہوگئی ہے اس کی بنا پر بجا طور سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ ان خرابیوں کو رفع کرنے کی کوششوں میں علماء کو سب سے زیادہ حصہ لینا چاہیے لیکن یہ توقع پوری نہ ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ کوئی زمانہ ایسے حق پسند علماء سے خالی نہیں رہا جنہوں نے اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی کی ہو اور اس دور میں بھی ایسے لوگ ہوئے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے اکثریت ایسے علماء کی رہی ہے اور اب بھی ہے جنہوں نے ذاتی اغراض کو ملی مفاد پر ترجیح دی اور اپنی مذہبی اجارہ داری برقرار رکھنے کے لیے یہ کوشش کرتے رہے کہ مسلم عوام صحیح اسلامی تعلیمات سے واقف نہ ہوں اور محض فروعات کو اصل دین سمجھ کر طرح طرح کے مناقشات میں الجھے رہیں۔

پاکستان اور دوسرے بیشتر ممالک کے مسلمانوں کی ازدواجی اور عائلی زندگی میں جو خرابیاں پائی جاتی ہیں وہ انفرادی، اجتماعی، ملی اور دینی ہر لحاظ سے نقصان رساں ہیں اور ان کو دور کرنے کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کی جاری ہے۔ چنانچہ بعض ملکوں نے اصلاحی تدابیر کو قانونی شکل میں نافذ کر دیا ہے اور بعض اس کی تیاری کر رہے ہیں۔ پاکستان میں بھی حکومت نے ایک عائلی کمیشن مقرر کیا تھا جس کی سفارشات کی بنا پر کچھ عرصہ قبل ایک آرڈی ننس جاری کیا گیا ہے۔ ملک کے تمام حلقوں نے اس کا خیر مقدم کیا ہے اور اس اعتبار سے بھی یہ قانون پسند کیا گیا کہ اس میں اسلامی تعلیمات کو بنیادی طور پر ملحوظ رکھ کر اصلاحی تدابیر اختیار کی گئی ہیں۔ چنانچہ عورتوں کو وہ حقوق واپس دیے گئے ہیں جو اسلام نے ان کو عطا کیے تھے لیکن رسوم و رواج کی بدولت وہ ان سے محروم کر دی گئی تھیں اور اس کے لیے مردوں کا کوئی حق چھینا نہیں گیا بلکہ صرف ایسی پابندیاں عائد کر دی گئی

ہیں کہ وہ کسی مشروط اجازت کو اپنا امتیازی حق سمجھ کر اس سے ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ ملک کے حالات کا تقاضا یہ ہے کہ موجودہ معاشرتی خرابیوں کو بتدریج دور کیا جائے۔ اور اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس قانون میں بھی بڑی احتیاط اور اعتدال سے کام لیا گیا ہے۔ ورنہ اسلامی احکام کے حدود میں رہتے ہوئے بھی اس سے بہت زیادہ آگے جانے کی گنجائش موجود ہے۔ اس قدر معتدل اور ضروری قانون سے اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور ملک کے دوسرے طبقوں کی طرح علماء کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ متفقہ طور پر ان اصلاحی قوانین کی تائید کریں جن کا مقصد غیر اسلامی رسوم و رواج کی زنجیروں کو توڑ کر معاشرہ کی ان خرابیوں کو دور کرنا ہے جو مسلمانوں کی ازدواجی اور اخلاقی زندگی پر تباہ کن اثر ڈالتی ہیں۔ لیکن ہر اصلاحی اور تعمیری اقدام کی طرح اس قانون کے بارے میں بھی بعض علماء نے یہ رائے قائم کر لی کہ اس سے اسلامی شعائر و اقدار مجروح ہوں گے اور ان لوگوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ اس سے عام مسلمانوں میں شدید ہیجان و اضطراب رونما ہو رہا ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے اور صرف طبقۂ علماء کے بعض افراد کے سوا پورے ملک نے اس قانون کا خیر مقدم کیا ہے۔

اس ضمن میں ان علماء نے یہ بھی شکایت کی ہے کہ یہ قانون بنا کر ایک مسلم حکومت نے دین میں وہ مداخلت کی ہے جو انگریزوں نے کبھی نہ کی تھی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کی فلاح و ترقی کے کام اگر مسلم حکومت نہ کرے گی تو اور کون سی حکومت کرے گی۔ انگریزی حکومت کو اس سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی جب کہ ان کے سامراجی مفاد کے لیے بہتر بھی یہی تھا کہ مسلمان ہر قسم کی خرابیوں میں مبتلا رہیں۔ انگریزوں کا طرزِ عمل یہ تھا کہ اسلام کے جو اصول اور مسلمانوں کے جو کام برطانوی مفاد سے متصادم ہوتے تھے ان کو دبا دیا جاتا اور جو خرابیاں مسلمانوں کی تباہی اور اسلام کی بدنامی کا باعث ہوتیں ان کو برقرار رہنے دیا جاتا۔ اب کیا یہ دلیل کسی طرح بھی قابلِ قبول ہو سکتی ہے کہ تعددِ ازدواج نے مسلمانوں کی زندگی میں جو خرابیاں پیدا کر دی ہیں ان کی اصلاح اس لیے نہ کی جائے کہ انگریزوں نے بھی اس میں کوئی مداخلت نہ کی تھی۔ ان خرابیوں کو دور کرنا انگریزوں کا نہیں خود مسلمانوں کا فرض تھا۔ لیکن دورِ غلامی میں مسلمانوں کی حالت ایسی تھی کہ وہ تمام خرابیوں کی اصلاح نہ کر سکتے تھے۔ اب اللہ تعالیٰ نے ان مسلمانوں کو حکومت و سلطنت عطا کی ہے اور وہ اپنی زندگی کو غیر اسلامی اثرات

اور رسوم و رواج سے پاک کر کے اسلامی احکام کے مطابق اصلاحات نافذ کر رہے ہیں۔ اب ان اصلاحات کو روکنے کے لیے انگریزوں کے طرزِ عمل کا سہارا لینے کی عجیب و غریب کوشش ناقابلِ فہم ہے۔

اصلاح و ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے والے بعض علماء کا طرزِ عمل یہ ہے کہ وہ ہر اصلاح کو خواہ وہ اسلامی احکام سے کتنی ہی مطابق کیوں نہ ہو خلافِ شرع قرار دیتے ہیں۔ اور یہ محسوس نہیں کرتے کہ اسلامی تعلیمات کوئی ایسا منتر یا راز نہیں ہیں جن سے ایک خود ساختہ مذہبی طبقہ کے سوا کوئی اور واقف نہیں ہو سکتا۔ اسلام کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کے اصول و احکام اس قدر واضح اور فطرتِ انسانی کے مطابق ہیں کہ مسلمان طبقہ علماء کی اجارہ داری کے بغیر بھی ان کو سمجھ سکتے ہیں۔ مسلمانوں کا باشعور طبقہ یہ خوب جانتا ہے کہ بادشاہوں کے ملوکانہ مقاصد نے سیدھے سادے مذہب کو پُر اسرار بنا کر ایک طبقہ کو مذہب کا اجارہ دار بنا دیا تھا۔ لیکن اس زمانے میں جب کہ ملوکیت کی شکست اور فکری آزادی کے ساتھ ساتھ علوم و سائنس نے حیرت انگیز ترقی کر لی ہے موجودہ علوم سے بے بہرہ علماء کی اجارہ داری اور دورِ جہالت کے رسوم و رواج اور توہمات کو برقرار رکھنا ممکن نہیں۔ اس زمانے میں نہ تو کسی مخصوص طبقہ کو مذہب کا ٹھیکہ دار بنایا جا سکتا ہے اور نہ ایسے تصورات قابلِ قبول ہو سکتے ہیں جو زندگی کے حقائق اور زمانے کے تقاضوں کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہوں۔

ازدواجی اور عائلی قوانین پر مولوی محمد شفیع صاحب کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے صدرِ پاکستان نے بڑی خوبی کے ساتھ یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ ہمارے ملک میں تعددِ ازدواج کے پردے میں جو مظالم ہوتے ہیں ان سے ہزاروں بے زبان عورتیں اور معصوم بچے تباہ و برباد ہو جاتے ہیں اور بے شمار خاندان معاشرتی، اخلاقی اور اقتصادی مصائب و مشکلات کا شکار بن جاتے ہیں۔ چنانچہ ازدواجی زندگی کی خرابیاں اور بُری رسمیں عورتوں اور بچوں کے حق میں ہندوؤں کی رسمِ ستی سے زیادہ ہولناک ہیں۔ کیونکہ ان کی وجہ سے بے شمار عورتیں ساری عمر ظلم و تشدد کی آگ میں جلتی رہتی ہیں۔ ان وحشیانہ مظالم کو ختم کرنے کا صرف یہی طریقہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عائد کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے ایسے ضابطے بنائے جائیں جو تعددِ ازدواج کی خرابیوں پر قابو پا سکیں۔ اصلاح

کا یہ کام خود معاشرہ کا فرض تھا۔ لیکن اس پر صدیوں سے جمود طاری ہے اور وہ فی الحال اس فرض کو انجام نہیں دے سکتا اس لیے حکومت نے یہ اہم کام اپنے ذمہ لیا اور ایک عائلی کمیشن کی سفارشات کی اساس پر یہ قانون بنایا گیا۔ اس کمیشن کے ممبر صاحب علم بھی تھے، قانون داں بھی تھے اور مسلمان بھی تھے۔ اور یہ قانون ایسا ہے جو اصولوں سے نہیں مسئلہ اصولوں کو نافذ کرنے کے طریقۂ کار سے تعلق رکھتا ہے۔ اور قرآن پاک کے احکام اور احادیث کی تشریح سے کسی طرح بھی متصادم نہیں ہوتا۔ اسلامی اصولوں سے انحراف تو قطعاً ناممکن ہے لیکن ان اصولوں پر عمل کرنے کے طریقوں کو زمانے کے تقاضوں کے مطابق اختیار کرنا ضروری ہے۔ یہ طریقے وضع کرنا نہ صرف حکومت بلکہ خود علماء کا بھی فرض ہے۔ کیونکہ ہم زندگی کو لادینی کے غار میں گرنے سے اسی طرح بچا سکتے ہیں۔ اگر آج کل کی دنیا میں قابل عمل اور نئے ذہنوں کے لیے قابل قبول طریقۂ کار اختیار نہ کیا گیا تو یہ کوتاہی زندگی اور مذہب کے درمیان ایک گہری خلیج پیدا کر دے گی۔ اسلام ہر زمانے کا ساتھ دینے اور اس پر اثر انداز ہونے والا مذہب ہے۔ اور جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے دینی فہم و بصیرت عطا کی ہے ان پر یہ بڑا بھاری فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ مذہب کو غلط روایات سے آزاد کر کے اس سائنسی دور کی روز افزوں ترقیوں کا ساتھ دیں ورنہ زندگی اور مذہب میں ہم آہنگی قائم نہ رہ سکے گی۔ اور یہ صورت حال مذہب کی نہیں بلکہ خود ہماری کوتاہی کا نتیجہ ہوگی۔ صدر جمہوریہ کے یہ بصیرت افروز خیالات ان لوگوں کے لیے خاص طور سے قابل غور ہیں جو زمانے کے تقاضوں کو نظر انداز کر کے ایک زندہ مذہب کو بے جان عقائد اور تباہ کن رسوم و رواج کا مجموعہ بنا دینا چاہتے ہیں۔